اطاعتِ رسولؐ

قرآن کی مزید توضیحات

نعیم صدیقی

وہی تین مراتب المائدہ میں اہلِ کتاب کا رویہ زیرِ بحث آتا ہے اور خصوصیت سے اس پہلو سے آتا ہے کہ وہ نہ صرف دینی لحاظ سے آنحضورؐ سے اختلاف رکھتے تھے بلکہ آپ کی سیاسی امارت و قضا کو بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ یہ بحث کئی گوشوں کی طرف پھیلتی اور پھر سمٹتی ہوئی ہمیں آیت ۵۵ تک لاتی ہے۔ اس میں مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۔ مطلب یہ کہ تمہارے رفیق تو بس اللہ اور اس کا رسول اور وہ اہلِ ایمان ہی رفیق ہیں جو نماز و زکوٰۃ پر کاربند ہیں۔ آیت ۵۶ میں اسی بات کو ذیل کے الفاظ میں ایک نتیجے تک پہنچا دیا کہ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۔ فرمایا کہ جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول اور اہلِ ایمان کی رفاقت اختیار کی تو بے شک اللہ کی یہی پارٹی غالب ہو کے رہنے والی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہاں تولّی یا رفاقت سے مراد وہ جذبہ و رابطہ ہے جو آدمی کے فکر و نظر کو اپنے زیرِ اثر لے لے۔ قرآن میں بے شمار مواقع پر تولّی، رفاقت اور معیت سے ایک ایسا محبت بھرا رابطہ مراد لیا گیا ہے جو ولی یا رفیق کی اطاعت اور ہم مسلکی پر منتج ہو۔ اللہ کو ولی و رفیق بنانے کے معنی یہاں یہ ہیں کہ اس کی خوشنودی کو سامنے رکھا جائے اور اس کے احکام کو پورا کیا جائے، اسی طرح رسولؐ کو ولی و رفیق بنانے کا مطلب بھی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ آپ کی رضامندی کا لحاظ کیا جائے اور آپ کے فرمان کو بسر و چشم قبول کیا جائے اور آپ سے نمونہ لیا جائے۔ آخر میں مسلمانوں کو ولی و رفیق بنانے کا اقتضاء یہ ہے کہ ان کی خیر خواہی کو معیارِ فکر و عمل بنایا جائے اور ان کے اجتماعی فیصلوں اور ان کی دینی و اخلاقی روایات اور ان کے معاشرے

کی اجتماعی فضا کا احترام کیا جائے۔ سورۂ المنٰفقون کی آیت ۸ بھی اگر ساتھ ملا لی جائے جس میں ایک دوسرے مضمون میں یہی ترتیب مذکور ہے اور پھر ان دونوں کو النساء کی آیت ۵۹ کی روشنی میں پڑھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ اسلامی نظام ریاست و معاشرہ کی ساخت کیا ہے۔ یہ ترتیب بتاتی ہے کہ حکم کا اولیں سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ وہ اصل حکمران ہے۔ دوسرا سرچشمہ رسولؐ کا یہ منصب ہے کہ وہ نمائندۂ الٰہی ہے، اور تیسرا سرچشمہ اسلامی معاشرہ (پہلے ساری امت، پھر اس کی مجلس شوریٰ، پھر اس کا امیر) ہے جسے خدا و رسول کے منصوص احکام کی روشنی میں روزمرہ کے معاملات کو سمجھنا اور اجتہادی فکر کے ساتھ چلانا ہے۔ وہی مشہور ترتیب کہ پہلے قرآن، پھر سنت، پھر اجماع (الجماعت)۔ یا پہلے خدا، پھر رسول، پھر اولی الامر!

قرآن نے آدمی کو سرزمینِ حق پر قائم رکھنے کے لیے استدلال کے اتنے جنگلے جگہ جگہ لگا رکھے ہیں، لیکن آفرین کہیے ان چست و چالاک ذہنوں کو جو ان سب کو پھلانگتے کہیں کے کہیں جا نکلتے ہیں!

چون و چرا کی گنجائش نہیں صرف یہی نہیں چاہا گیا کہ خدا کے اذن کے تحت رسول اللہ کو مطاع اور مصدرِ حکم مانا جائے بلکہ پورے قرآن میں مطالبہ بے چون و چرا اطاعت کا ہے اور اس لحاظ سے اطاعتِ رسولؐ اطاعتِ امیر کے مقابلے میں بالکل امتیازی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اس بارے میں ایک واضح رہنمائی ہمیں سورۂ احزاب کے سلسلۂ کلام سے ملتی ہے۔ سورۂ احزاب میں آنحضرتؐ کے واقعۂ ایلاء کے سلسلہ میں ازواجِ مطہرات سے جو خطاب کیا گیا ہے اس میں رسول اللہ کی اتھارٹی کی طرف بار بار اشارہ کیا جاتا ہے۔ فرمایا:۔ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ "اگر تم چاہت رکھتی ہو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی"۔ (آیت ۲۹) پھر فرمایا:۔ مَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ "جو کوئی تم میں سے اطاعت گذاری کرے اللہ اور اس کے رسولؐ کی" (آیت ۳۱) پھر فرمایا:۔ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ "اور اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی" (آیت ۳۳)۔ آخر مقامِ غور ہے کہ ایک سلسلۂ کلام میں پے در پے کیوں خدا کے ساتھ رسولؐ کی چاہت اور اطاعت گذاری پر اتنا زور دیا جا رہا ہے؟ نظامِ شریعت و طاعت میں کوئی اہمیت رسولؐ کی بہ حیثیت رسولؐ (نہ کہ بہ حیثیتِ امیر) ہے تو جبھی تو ایک مرتبہ نہیں، چند سطروں میں تین تین بار تاکید ایک ہی تقاضا کیا جاتا ہے۔ پھر اسی سلسلۂ کلام میں فرمایا کہ:۔ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ

وَالْحِکْمَۃِ ۔ یاد تازہ رکھو اللہ کی آیات کی جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں، نیز الحکمۃ کی"! اوپر جس طرح اللہ اور رسولؐ کی طرف دعوت دی جا رہی تھی، اسی طرح یہاں بھی آیت اللہ اور حکمت کی طرف دو گونہ دعوت سامنے آتی ہے۔ اگر حکمت وہی چیز ہو جو آیات میں شامل ہے تو یہ کلام کوئی فصیح و بلیغ کلام نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ اُس تعلیم کی طرف ہے جو آیاتِ الٰہی کی تفسیر و تعبیر کے طور پر پیغمبر اپنے قول و عمل سے دیتا ہے۔ یُوں بھی "تلاوت" "آیات" کی تو ہوتی ہے، حکمت کی تلاوت سمجھ میں نہیں آ سکتی ہے کہ ہم آیت اللہ اور حکمت کو ہم معنی الفاظ کی ترکیبِ عطفی قرار دے سکیں۔ دونوں الگ الگ ابواب بالکل الگ الگ ہیں، بس ایک کو اولیت حاصل ہے، دوسرے کو ثانویت۔ ایک متن ہے، دوسرا شرح!

اب دیکھیے کہ جو سلسلۂ کلام یوں چلا آ رہا ہے وہ ہمیں بالآخر کس بات پر پہنچاتا ہے۔ آیت ۳۶ میں حقیقت بالکل کھول کے کہہ دی کہ :۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا ۝	کسی ایماندار مرد و عورت کا یہ مقام نہیں کہ جب کسی معاملے میں اللہ اور اس کا رسولؐ فیصلہ کر دیں تو پھر ان کو اپنے معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار باقی رہ جائے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے تو پھر وہ کھلی گمراہی میں جا پڑا۔

ان الفاظ کو پڑھیے، کسی بھی ترجمے کی مدد سے پڑھیے اور پھر سوچیے کہ ایک صاف ذہن کو اس میں سے کیا ملتا ہے؟ کیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے لیے قرآن کافی ہے اور ہمیں ارشاداتِ رسولؐ سے کوئی مطلب نہیں؟ نکتہ نکالا جا سکتا ہے کہ لفظ قضیٰ سے مراد عدالتی فیصلے ہیں جو اپنے وقت میں واجب النفاذ تھے، اس کے بعد ان کی قدر و قیمت ختم ہو گئی۔ مگر ذرا دیر اور تامل کیجیے اور بتائیے کہ رسولؐ کو تو خیر آپ نے عدالت کے منصبِ قضا پر بٹھا کر اس آیت کا ایک خاص مفہوم اخذ کر لیا، کیا خدا کے بارے میں بھی پوزیشن یہی فرض کرنی ہوگی کہ وہ بھی ایک جج یا مجسٹریٹ بن کر بیٹھا تھا اور روزمرہ مقدموں میں فیصلے دے رہا تھا۔ اور وہ سب عدالتی فیصلے بھی وقتی تھے؟ قرآن کے مدعا کو مسخ کرنے والا ذہن ایک الجھن سے نکل کر دس اور الجھنوں

میں جنس جانا ہے۔ لغت سے "قضی یقضی قضاءً" کے مفہوم کے بارے میں گواہی لیجیے تو وہ بتائے گا کہ جب قضی بین الخصمین آئے تو حکم و فصل کے معنی حاصل ہونگے، یعنی دونوں کے اختلافی قضیے کو چکایا اور فیصل کیا۔ اسی طرح جب قضی الامر لہ او علیہ آئے گا تو مطلب یہ ہوگا کہ اس کے حق میں یا اس کے خلاف فیصلہ دیا۔ لیکن جب قضی الشیٔ یا قضی الامر آئے تو اعلمہٗ و بیّنہٗ کا مدعا حاصل ہوگا یعنی اس چیز یا معاملے کو خوب اچھی طرح سمجھایا اور پر نتھارا، واضح کیا، یا یوں کہیے کہ قطعی طور پر طے کر دیا! زیر بحث آیت میں "قضیٰ امراً" آیا ہے، لہٰذا یہ گفتگو عدالتی فیصلوں کے لیے محدود نہیں ہے بلکہ وسیع ہے۔ یہاں قضاء سے مراد زندگی کے مسائل و معاملات میں قانونی و اخلاقی احکام، قوانین اور ہدایات کا مقرر کرنا ہے۔ اس سلسلے میں کلی اور اساسی اختیار سارے کا سارا اللہ تعالیٰ کا ہے، لیکن ساتھ ہی رسول اللہ کا تبعی اختیار بھی مذکور ہوا۔ نمائندہ الٰہی ہونے کی حیثیت سے وہ بھی مصدر حکم و ہدایت ہے۔ یعنی زندگی کے مختلف مسائل و معاملات میں جس کے بارے میں خدا کا کوئی حکم و قانون صادر ہو جائے یا رسول اللہ صلعم کی طرف سے جس میں کوئی امر و نہی سامنے آجائے اس میں پھر کسی مسلمان مرد و عورت کو اپنے جی سے کوئی فیصلہ کرنے اور کوئی مختلف صورت تجویز کرنے کا اختیار نہیں رہتا۔ "مِنْ اَمْرِهِمْ" کا زور کلام یہ کہہ رہا ہے کہ وہ معاملات جن کو بالکل اپنے معاملات سمجھا جاتا ہو، ان میں بھی خدا اور اس کے رسولؐ کا کوئی فیصلہ سامنے آنے پر کسی فرد یا گروہ کا پھر اپنا اختیار باقی نہیں رہتا کہ وہ چاہیں تو اس فیصلے کو مانیں اور چاہیں تو اسے بالائے طاق رکھ کر کوئی دوسرا راستہ اپنے لیے نکال لیں۔ اور جو لوگ خدا و رسول کے مقابلے میں اپنا یہ اختیار قائم رکھیں ان کا ذکر یوں کیا کہ "مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" یعنی اللہ کے احکام کے مقابلے میں جو لوگ نافرمانی کی روش اختیار کریں ان کے ساتھ مساوی یا نہ مرتبہ پر وہ سب بھی شامل ہیں جو رسول اللہ کی حکم عدولی کرنے والے ہوں۔ ان دونوں کے لیے صریح گمراہی یکساں مقدر ہوئی۔

بات یہیں سے بات نکلتی ہے اور بالآخر نبی صلعم کا مرتبۂ بلند ان الفاظ میں نمایاں کیا جاتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۔ ۔ ۔ تَسْلِيْمًا (آیت ۵۶) اس کے متصل ہی اُن بدبختوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو نبی کے احسان مند ہو کر اس سے محبت کرنے اور اس کے لیے دعائے رحمت کرنے کے

بجائے اُلٹا اسے ایذا دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو "اَلَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ" (آیت ۵۷)۔ یہاں جس ایذا دہی کا ذکر ہے وہ اپنے حقیقی معنوں میں تو تھی ہی صرف رسول کے لیے، اللہ کو کوئی کیا ایذا دے گا، اللہ کے لیے ایذا کا مفہوم محض اپنے گستاخ بندوں کی روش کا ناپسندیدہ و مکروہ ہونا ہے یعنی جو لوگ اس کے رسولؐ کی بے احترامی اور نافرمانی کر رہے تھے وہ رسول کے لیے ایذا رساں تھے اور اللہ کی نگاہ میں ان کی روش ملعون تھی۔ (لعنھم اللہ فی الدنیا والاٰخرۃ)

اِن دشمنوں اور منافقوں کے انجامِ اُخروی کو پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ محاسبے کا وقت آ جانے پر ان کا حال یہ ہوگا کہ وہ اوندھے مونہوں آگ میں ڈالے جائیں گے اور پھر کہیں گے کہ یٰلَیْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰہَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا (آیت ۶۶) کاش کہ ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور رسولؐ کی اطاعت کی ہوتی۔ اس آیت میں تو "اطعنا" کا فعل ہی دو مرتبہ الگ الگ استعمال کر کے دونوں حصوں کو باہم دگر عطف کیا ہے۔ یہاں کوئی تاویل نہیں چل سکتی۔ دو اطاعتیں الگ الگ سامنے آ گئیں، دو مصادرِ حکم و ہدایت بالکل نکھر گئے۔ خدا کی اطاعت کے تحت رسول کی اطاعت کا مقام یہاں بالکل واضح ہو گیا۔ اب سورت اپنے خاتمہ کی طرف جا رہی ہے اور مسلمانوں کو بڑے مشفقانہ انداز میں کچھ تلقینات کی گئی ہیں جن میں یہ تلقین مذکورۂ بالا اجزائے کلام سے مربوط ہو جاتی ہے کہ جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے تو اس نے بڑی مراد پائی۔ ایک رویے کا انجام تھا "فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا"۔ اور دوسرے مسلک کا انجام ٹھہرا "فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا" (آیت ۷۱)

اِن اجزائے کلام پر سلسلہ وار پھر غور کیجیے اور خدا لگتی بات کہیے کہ رسول کے مطاع ہونے کو کسی صورت بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

نائبِ مختار | ارضِ خیبر کے فتح ہونے کے بعد مالِ فَے کے متعلق سورۂ حشر میں اصولی فیصلے کیے گئے ہیں ان میں سے سب سے بڑا فیصلہ یہ ہے کہ مالِ فَے مسلم سوسائٹی کی اجتماعی ضروریات میں صرف ہوگا۔

۱؎ اگلی آیت میں دشمنوں اور منافقوں کی طرف سے مومنین و مومنات کو ایذا دیئے جانے کا ذکر ہے۔ اور اس طرح یہاں بھی وہ ترتیبِ سہ گانہ قائم ہو جاتی ہے جو نظامِ اجتماعی کے سلسلے میں قرآن کے پیشِ نظر ہے۔

اسے اللہ کی راہ میں خرچ کیا جانا چاہیے، خدا کے رسولؐ کو نظامِ اجتماعی کی طرف سے اس میں سے ضروریات بہم پہنچائی جا سکتی ہیں۔ نیز آپؐ کے اپنے ذوی القربیٰ کے ادائے حقوق اور ان سے حسنِ سلوک کے لیے اس فنڈ میں گنجائش رکھی جا سکتی ہے، پھر سوسائٹی کے حاجت مندوں اور مسافروں کی کفالت کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں فرمایا کہ:-

وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (حشر: ۷)

جو کچھ رسول تم کو دے، سو لے لو! اور جس چیز سے وہ روک دے اس سے رُک جاؤ۔

یہ بات تو صاف ہے کہ اس نص کا اصل مورد فئے کا مسئلہ ہے۔ لیکن جو خاص پوزیشن رسول اللہ کی اس میں بیان ہوئی ہے وہ ایسی نہیں ہے جو ایک اسی معاملے کے لیے خاص ہو یعنی یہ کہ جو کچھ بھی رسول قرآن کے قانون کے تحت مالِ فئے میں کرے اور جتنا کچھ کسی کو اس میں سے دے اور جتنے مال کو دوسری ضروریات کے لیے روک لے، مسلمانوں کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ اعتراض کریں، وہ اختلاف کا مظاہرہ کریں یا وہ اس تصرف میں کوئی غلطی پکڑیں۔ جو کچھ دیا جا رہا ہو وہ چپ چاپ خوشدلی سے لیتا ہو گا اور جس شے سے روکا جا رہا ہو اُس سے رُک جانا ہو گا۔ یہ حیثیت کسی امیر کی امارت کی نہیں ہو سکتی کہ روزمرہ معاملات میں اس کے فیصلوں پر اعتراض یا اختلاف نہ کیا جائے اور بے چون وچرا مالیاتی معاملات میں اس کی ہر بات کو مان لیا جائے۔ اس خاص حیثیتِ رسالت کے پیشِ نظر آج تک ہمارے مفکرین قرآن نے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ خدا کے رسول کی ہر معاملے میں اصولی پوزیشن یہی ہے کہ وہ جس چیز کا مجاز ٹھہرا دے اس پر مسلمانوں کے لیے اکتفا لازم ہے اور جس سے روک دے، اس سے رُک جانا واجب ہے۔ یعنی رسول ایک نائب مختار ہے جو روزمرہ امور میں منشائے الٰہی کے مطابق مسلمانوں کو یہ رہنمائی دیتا ہے کہ وہ کیا لیں اور کیا چھوڑ دیں۔ وہ ان کو ردّ وقبول کے پیمانے بہم پہنچاتا ہے۔ اور ترک و اختیار کی کسوٹیاں دیتا ہے۔

واضح رہے کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق کا سرے سے ذکر نہیں کیا، بلکہ یہاں مجرد رسول اللہ کی حیثیت پیش کر دی ہے۔ اس وجہ سے مغالطے کی گنجائش نہیں رہی۔ فرق صرف اتنا ہے

کہ یہاں مالِ فے کے بارے میں تو رسول کے نائب مختار ہونے کو صراحت سے پیش کر دیا، لیکن یہ حیثیت باقی جملہ معاملات کے لیے دلالۃ النص کے ذریعے منکشف ہوتی ہے۔ لیکن اس کمی کو قرآن کے وہ دوسرے بے شمار مقامات پورا کر دیتے ہیں جہاں مجرد حیثیت رسالت پر زیادہ صراحت سے گفتگو کی گئی ہے۔

سورۂ نور میں آیت ۵۶ میں مسلمانوں کو غلبۂ دین کی جدوجہد کی دعوت دیتے ہوئے نصیحت فرمائی کہ "نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور رسولؐ کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے"۔ ظاہر ہے کہ نماز و زکوٰۃ تو خدا کی عبادت و اطاعت ہی ہیں! ان کے ساتھ ساتھ جس تیسری چیز کا مطالبہ کیا وہ "اطاعتِ رسولؐ" ہے۔ یہاں خدا کی اطاعت اور رسول کی اطاعت اس انداز سے بیان نہیں ہوئیں کہ آپ رسول کی اطاعت کو خدا کی اطاعت میں گم کر سکیں بلکہ رسول کی اطاعت ایک مستقل تقاضے کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ دوسری طرف "رسول کی اطاعت کرو" کو کسی بھی تاویل سے "امیر (یا حکومت) کی اطاعت کرو" کے مفہوم میں نہیں بدلا جا سکتا۔ صاف طور پر یہاں پوزیشن نائبِ مختار کی ہے یا نمائندۂ مستند کی۔

یہ پوزیشن صرف حضرت محمد مصطفیٰؐ ہی کے لیے نہ تھی، خدا نے ہر پیغمبر کو اسی طرح مطاع بنایا ہے۔ سامری کی شعبدہ بازی جب بنی اسرائیل میں فسادِ ایمان پیدا کر دیتی ہے تو حضرت ہارون اسکی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں اور لوگوں کو شرک سے ہٹا کر ربِ رحمٰن کی طرف بلاتے ہیں، لیکن ساتھ ہی پیغمبرانہ اتھارٹی سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ "فاتبعونی واطیعوا امری" (طٰہٰ ۹۰) یعنی میرے پیچھے چلو اور میرے احکام کی اطاعت کرو۔ کیا کام تھا کسی قاصد کا کہ وہ اس مقامِ اختیار سے بولتا؟ پھر موسیٰ علیہ السلام طور پر اپنا دورِ خلوت گذار کر واپس آتے ہیں تو قوم کے حالِ زبوں کا جائزہ لینے کے بعد جب سیدنا ہارون سے باز پرس کرتے ہیں تو ان الفاظ میں کرتے ہیں: اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؟ افعصیت امری ؟ (طٰہٰ ۹۳) یعنی کیا آپ نے میری پیروی چھوڑ دی ؟ کیا آپ نے میری حکم عدولی کی ؟

اور جیسا کہ ہم ابتدائی صفحات میں واضح کر آئے ہیں کہ پیغمبر پر پیغمبر آتا ہے اور دعوت یوں دیتا ہے کہ "اِتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ" خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو! کیا ان تصریحات کے بعد

بھی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ رسول کو مطاع اور مصدرِ حکم و ہدایت نہ مانا جائے؟

پہلے ہم سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ (اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ..... ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ) پر گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں پھر یاد دلاتے ہیں کہ اس مقام پر رسول کے مطاع ہونے کی مستقل حیثیت کو بڑے زور سے بیان کیا گیا ہے، اور فعل بھی "اطاعت" کی جگہ "اتباع" کا اختیار کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے سرے سے آتا ہی نہیں۔ پھر مزے کی بات یہ کہ اس آیت میں "الرسول" کی جو تعریف پیش کی ہے کہ وہ "نبیِ امی" ہے اور جملہ موصولہ بنا کر یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰۃِ وَالْاِنْجِیْلِ کے الفاظ میں اس کے بارے میں اتنا گہرا اور مضبوط تعین پیدا کر دیا ہے کہ کوئی ماہرِ تاویل کتنا ہی ترقی پسند کیوں نہ ہو "الرسول" کے مقام پر "امیر" اور "حکومت" کا تصور نہیں رکھ سکتا۔ اس سے اگلی آیت میں بھی یہی صورت ہے۔ فرمایا فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَکَلِمٰتِہٖ وَاتَّبِعُوْہُ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ (۱۵۸)۔ مطالبہ ہے کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسولِ نبی پر جو اللہ اور اس کی آیات پر خود بھی ایمان رکھتا ہے اور اسکی پیروی کرو، توقع ہے کہ اس طرح تم ہدایت پا سکو گے۔ یہاں بھی رسول کی ذاتِ خاص (نہ کہ مجردِ منصبِ امارت) بالکل متعین ہو گئی اور رسالت و نبوت کے منصب کے ساتھ متعین ہوئی اور اس کے بعد حکم ہوا کہ اس ذاتِ خاص کی جو ہمارا رسول و نبی ہے پیروی کرو۔ یہاں بھی اطاعت کے بجائے اتباع کا فعل لیا اور حقیقت کو تاویل کے حملوں سے محفوظ کر دیا۔

پھر وہ سورج کی طرح روشن آیت کہاں چھپ کے رہ جائے گی کہ:۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (آل عمران۔۳۱)	کہیے کہ اگر تم لوگ اللہ سے محبت رکھتے ہو تو پھر میری پیروی کرو تاکہ اللہ بھی تم کو چاہے۔

یہ ہمالیہ جتنی ضخیم اور بوجھل حقیقت جو قرآن کے پورے کلام میں رچی بسی ہوئی ہے اس کے بارے میں جو لوگ خود مغالطے میں پڑ سکتے ہیں ان کی عقل کا ماتم کیجیے اور جو لوگ دوسروں کو دھوکے میں ڈال سکتے ہیں ان کی ساحری کی داد دیجیے!

معیتِ رسولؐ کی اہمیت سورۂ فتح کی آخری آیت (۲۹) کو پڑھیے۔ اس میں عرب کی اسلامی جماعت کی جو تعریف بیان کی گئی ہے اسے معیتِ رسولؐ کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ اوپر سے دوست دشمن دونوں عناصر پر واضح کیا جا رہا ہے کہ ایک طرف مخالفین ہیں جو حمیتِ جاہلی کے علمبردار ہیں اور دوسری طرف رسول اور اہلِ ایمان ہیں جو کلمۂ تقویٰ کو لے کے کھڑے ہوئے ہیں، اب تم خود سوچ لو کہ کون اس کشمکش میں کامیابی پانے کا اہل (احق بہا و اھلہا) ہے۔ اس کے بعد جماعتِ اہلِ حق کی اخلاقی حیثیت کا نقشہ پورے پورے زورِ بیان کے ساتھ کھینچا ہے کہ اِدھر دیکھو یہ محمدؐ رسول اللہ ہیں اور یہ ان کے ساتھی ہیں جو کفار کے لیے مضبوط اور آپس میں نرم خو ہیں ․ ․ ․ ․ ․ ․ الخ! اس موقع پر "والذین معہٗ" میں جس معیت کو تعریفی اسلوب سے پیش کیا گیا ہے وہ محض جسمانی قُرب کے معنوں میں نہیں بلکہ وہ اطاعت و اتباع کے معنوں میں ہے۔ اسی معنی میں جب رسول کی معیت حاصل ہوتی ہے تو وہ نتائج برآمد ہوتے ہیں جن کو اس لمبی آیت میں پیش کیا گیا ہے۔ رسول کے ساتھ اسی معنی میں مسلمانوں سے معیت مطلوب ہے[1]۔

اب لیجیے الفرقان کا وہ سلسلۂ کلام جس میں آخرت کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتایا جاتا ہے کہ وہ دن کفار کے لیے بڑا سنگین ہو گا (آیت ۲۶) اور اُس دن ہر ظالم مارے ندامت و پشیمانی کے اپنے ہاتھ دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کہے گا کہ "يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا (آیت ۲۷)" — "اے کاش کہ میں رسول کے ساتھ ہو کر (حق کا) راستہ اختیار کرتا" ! کیا مطلب؟ یہی نا کہ رسول کی دعوت پر لبیک کہتا، پھر وہ زندگی کی وادی میں جس رُخ پر حرکت کرتا میں بھی اسی رُخ پر حرکت کرتا، جس معاملے میں جو موڑ رسول مُڑتا وہی میں بھی مُڑتا۔ جہاں رسول ٹھٹکتا، میں بھی وہیں ٹھٹکتا، جہاں سے وہ تیز گام ہو جاتا، وہاں سے میں بھی رفتار بڑھا لیتا۔ کہاں معیتِ رسول کی یہ اہمیت، اور کہاں یہ مقام کہ ہم نے قرآن ہاتھ میں لیتے ہی اعلان کر دیا کہ بس اب رسولؐ سے ہمارا کوئی کام نہیں! قرآن کو براہِ راست خود پڑھیے تو آپ کو تسلی ہو جائے گی کہ اطاعت و اتباعِ رسول سے آزاد ہو جانے والے ماڈرن اسلام کا طلوع قرآن کے مطلع سے تو

---

[1] قرآن میں معیت بہ معنی نصرت، معیت بہ معنی تعاون، معیت بہ معنی ہم مسلکی و ہم کیشی، معیت بہ معنی اتباع و اطاعت، سبھی استعمالات موجود ہیں بلکہ معیت کے بعض اور مفہوم بھی جا بجا ملتے ہیں۔

ہو نہیں سکتا!

معیارِ وفاداری سورۃ البقرہ کی آیت ۱۴۲ سے تحویلِ قبلہ کا ایک سلسلۂ کلام شروع ہوتا ہے۔ ہجرت کے سولہ سترہ ماہ بعد (رجب یا شعبان سنہ ۲ھ) میں بیت المقدس کے بجائے کعبہ شریف کو قبلۂ نماز مقرر کیا گیا۔ یہ حکم آیت ۱۴۴ میں ہے۔ اس آیت کا نزول عین اس حالت میں ہوا جبکہ آنحضور صلعم بشر بن براء بن معرور کے مکان پر ظہر کی نماز کی امامت فرما رہے تھے اور نماز کے دوران میں رخ بدلا گیا۔ تحویلِ قبلہ کے ذریعے درحقیقت امامتِ اقوام کا منصب اہلِ کتاب سے امتِ محمدیہ کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ یعنی اب یہود سے امتِ وسط کا مرتبہ سلب کر لیا گیا اور مسلمانوں کو اس پر فائز کر دیا گیا۔

اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ایک اہم حقیقت یہ واضح فرمائی کہ بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے (اور اب بدل دینے) کا اصل منشا یہ ہے کہ رسول اللہ پر اعتماد کر کے آپ کے پیچھے چلنے والے لوگ ان سفہاء سے الگ ہو جائیں جن کو رسول کے قول و عمل پر اتنا اعتماد نہیں ہے کہ وہ بے چون و چرا آپ کے پیچھے چلیں۔ نیز جن کے قومی و نسلی تعصبات حق پرستی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ فرمایا: وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ (آیت ۱۴۳) یعنی تم جس طرف پہلے رخ کرتے تھے اس کو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون لوگ رسول کا اتباع کرتے ہیں اور کون (اسی آزمائش میں کھوٹے ثابت ہو کر) پیچھے پلٹ جاتے ہیں۔ پہلے قبلہ بیت المقدس مقرر کیا گیا تو اہلِ عرب، خصوصاً قریش کے لیے بڑی آزمائش تھی اور پھر جب مدنی دور میں کعبہ کو قبلہ ٹھہرا دیا گیا تو یہود اور ان کے ساتھیوں کے لیے آزمائش پیدا ہو گئی، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ حکم تحویل مسلمانوں کے لیے بھی ایک ٹسٹ TEST بن گیا جو ایک قبلہ کے خوگر ہو چکے تھے۔

دیکھیے اس موقع پر رسول کے منصب کو کس درجے کی اہمیت دی گئی ہے۔ چاہا یہ گیا ہے کہ خدا کے رسول کو ایک اتھارٹی مان کر اس کا اس طرح اتباع کیا جائے کہ احکامِ الٰہی کے تحت جدھر سے وہ منہ موڑے اُدھر سے منہ موڑ لیا جائے اور جدھر وہ رُخ کرے اُدھر اس کے سارے ماننے والے بے چون و چرا اپنا رُخ کر لیں۔ اس موقع پر خدا تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ ہم یہ ٹسٹ لینا چاہتے تھے کہ کون

ہمارے حکم کو اپنے تعصبات پر اقدم رکھتا ہے۔ آزمائش کا منشا یہ نہیں بیان کیا کہ کون قرآن کی آیات پر ایمان کا مظاہرہ کرتا ہے اور کون اُلٹے قدموں پھر جاتا ہے، بلکہ رسولؐ کی شرعی حیثیت کو پوری طرح نمایاں کرتے ہوئے ٹسٹ یہ سامنے رکھا کہ کون ہمارے رسولؐ کے رُخ کے مطابق اپنا رُخ رکھتا ہے۔

اگر رسولؐ سے اُمت کا معاملہ قرآن لے لینے سے زیادہ کچھ نہ ہوتا تو سوچ کر بتائیے کہ اس طرح سے رسولؐ کی حیثیت کو اجاگر کر کے لانا کیا ضرور تھا؟ پھر تو اس طرح کے مواقع کلام انتہائی الجھنیں اور غلط فہمیاں پیدا کرنے والے ہوں گے اور خدا سے کوئی مسلمان یہ امید نہیں کر سکتا کہ وہ ایسی مغالطہ آمیز باتیں کرنے والا ہے۔ (باقی)